ٹرانس جینڈر اشخاص (حقوق کا تحفظ) قانون، 2018ء: مسئلہ کیا ہے؟ (1)

کیا واقعی یہ قانون اسلامی احکام سے متصادم ہے؟ کیا واقعی اس قانون سے ہمارے خاندانی نظام کی بنیادیں اکھاڑی جارہی ہیں؟ کیا واقعی اس قانون کے ذریعے بے حیائی کے لیے راستے کھولے گئے ہیں؟
یہ اور اس طرح کے کئی سوالات لوگ پوچھ رہے ہیں۔ اس لیے چند گزارشات پیش کی جارہی ہیں، لیکن پہلے دو اصولی نکات۔

دو اصولی نکات

پہلی اصولی بات یہ ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے (آئین کی دفعہ 1)؛ اس کا ریاستی مذہب اسلام ہے (آئین کی دفعہ 2)؛ یہاں حاکمیت اعلی اللہ تعالیٰ کی ہے اور پارلیمان سمیت تمام ریاستی و حکومتی اداروں کے پاس اختیارات کی حیثیت مقدس امانت کی ہے جسے وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر استعمال کرنے کے پابند ہیں (آئین کی دفعہ 2اے)؛ یہاں لوگوں کو آزادی اور دیگر حقوق میسر ہوں گے، لیکن "جیسا کہ اسلام نے دیے ہیں" (آئین کی دفعہ 2اے)؛ یہاں کوئی قانون اسلامی احکام سے متصادم نہیں بنایا جاسکتا اور جتنے رائج الوقت قوانین ہیں، ان کو اسلامی احکام سے ہم آہنگ کرنا لازم ہے (آئین کی دفعہ 227)؛ یہاں قوانین میں اصلاحات کے لیے جو لا اینڈ جسٹس کمیشن بنایا گیا ہے، اس پر بھی لازم ہے کہ نئی قانون سازی کے لیے تجاویز دیتے ہوئے سماجی انصاف کے متعلق اسلامی اصولوں کی پابندی کرے (لا اینڈ جسٹس کمیشن کا قانون، دفعہ 6(1))؛ اور یہاں عدالتوں پر لازم ہے کہ کسی بھی قانون کی تعبیر و تشریح کرتے ہوئے، یعنی اس کا مفہوم متعین کرتے ہوئے، یہ یقینی بنائیں کہ قانون کا مفہوم اسلامی احکام سے متصادم نہ ہو (قانونِ نفاذِ شریعت، 1991، دفعہ 4)۔
اس لیے یہ کہنا کہ کسی قانون کے متعلق یہ بحث اٹھانا کہ یہ اسلامی احکام سے متصادم ہے یا نہیں، "کٹھ ملاؤں" کا کام ہے، نری جہالت ہے، خواہ ایسی بات کہنے جاہلوں نے دنیا کی اچھی یونیورسٹیوں سے بڑی بڑی

ڈگریاں لی ہوں۔ جب تک اس ملک کے آئین اور قانون کی اسلامی شناخت ختم نہیں کر دی جاتی، اس سوال سے جان نہیں چھڑائی جاسکتی۔ واضح رہے کہ سپریم کورٹ کئی فیصلوں میں قرار دے چکی ہے کہ آئین کی اسلامی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے صرف چند دفعات میں ترمیم کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے نیا آئین بنانا ہوگا اور نیا آئین بنانے کے لیے موجودہ پارلیمان کے پاس اختیار نہیں ہے، بلکہ نئی آئین سازی کے لیے عوام سے باقاعدہ اختیار لے کر آنا پڑے گا۔ (مثال کے طور پر دیکھیے، الجہاد ٹرسٹ کیس 1996 اور فوجی عدالتوں کے متعلق کیس 2015۔) یہ بھی دیکھ لیجیے کہ جنرل مشرف کی روشن خیال اعتدال پسندی کے دور میں کی جانے والی 17ویں ترمیم کے ذریعے آئین میں بہت ساری ترامیم کی گئیں لیکن اسلامی دفعات کو ہاتھ نہیں لگایا جاسکا۔ اسی طرح جب 18ویں ترمیم کے موقع پر پورے آئین پر نظرِ ثانی کر کے اس کی "اوورہالنگ" کی کوشش کی گئی، اس وقت بھی کسی کو اسلامی دفعات کو چھیڑنے کی جرات نہیں ہو سکی۔ اس لیے مٹھی بھر سیکولر عناصر اور اقوامِ متحدہ اور دیگر اداروں واقوام سے فنڈز لینے والی این جی اوز کو یہ بات گرہ سے، یا پلو سے، باندھ لینی چاہیے کہ انھیں اس ملک میں رہنا اور یہاں کام کرنا ہے، تو اسلامی اصولوں کے ساتھ، اور ان کے سائے میں، رہنا سیکھ لیں، خواہ آپ کو اچھا لگے یا برا۔

ٹرانس جینڈر اشخاص (حقوق کا تحفظ) قانون، 2018ء: مسئلہ کیا ہے؟ (2)

دوسری اصولی بات یہ ہے کہ کسی قانون کے اسلامی احکام سے متصادم ہونے یا نہ ہونے کے مسئلے پر لوگوں کی آرا مختلف ہو سکتی ہیں لیکن ریاستی سطح پر ہم نے اس مقصد کے لیے دو ادارے بنائے ہیں: ایک اسلامی نظریاتی کونسل اور ایک وفاقی شرعی عدالت۔ کونسل قانون سازی کے مرحلے پر، قانون بننے سے قبل بھی، اپنی رائے دے سکتی ہے، جبکہ شرعی عدالت کا کام قانون بن چکنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ گویا قانون بننے کے مرحلے میں اگر یہ سوال اٹھے کہ اس قانون کی کوئی شق اسلامی احکام سے متصادم ہے یا نہیں، تو کونسل اس سوال کا جواب دینے کے لیے موجود ہوتی ہے، جبکہ قانون بن چکنے کے بعد اس کے خلافِ اسلام ہونے یا نہ ہونے پر فیصلہ دینے کے لیے شرعی عدالت کے پاس اختیار ہے۔

کونسل اس سوال کے جواب میں جب اپنی رائے دیتی ہے، تو اس کی حیثیت تجویز اور سفارش کی ہوتی ہے، جبکہ شرعی عدالت کے فیصلے کو الزامی (binding) حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ کونسل کی سفارش پر غور کرنا پارلیمان پر لازم ہے، خواہ غور کے بعد وہ اسے قبول کرے یا نہ کرے، لیکن شرعی عدالت نے اگر قانون کو یا اس کی کسی شق کو اسلامی احکام سے متصادم قرار دیا تو اسے ماننا پارلیمان پر بھی اور سپریم کورٹ سمیت تمام عدالتوں پر ماننا لازم ہو جاتا ہے، الا یہ کہ سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ اس فیصلے کو تبدیل کردے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ کونسل کی سفارشات ماننا لازم نہ سہی، ان پر غور تو لازم ہے، لیکن اس کے باوجود اس موضوع پر کونسل کی سفارشات کو پارلیمان نے سرے سے درخورِ اعتنا سمجھا ہی نہیں۔ سینیٹ کی سٹینڈنگ کمیٹی نے جس طرح کونسل کی سفارشات کے ساتھ کھیل کھیلا، وہ ایک الگ داستان ہے۔ باقی رہی بات شرعی عدالت کی، تو وہاں اس قانون کے خلاف درخواست زیرِ التوا ہے اور پتہ نہیں کب تک زیرِ التوا رہے گی۔ پھر جب شرعی عدالت فیصلہ دے بھی دے، تو اس کے بعد اپیل کا مرحلہ آئے گا اور اپیل کا فیصلہ ہونے تک شرعی عدالت کا فیصلہ معطل رہے گا۔ اس لیے جب سینیٹ کی سٹینڈنگ کمیٹی برائے حقوق انسانی نے اپنی آخری میٹنگ میں سینیٹر مشتاق احمد خان کو یہ مشورہ دیا کہ اگر وہ اسے اسلامی احکام سے متصادم سمجھتے ہیں، تو اس کے خلاف شرعی عدالت میں جائیں، تو انھوں نے کہا کہ وہاں تو تیس سال لگ جائیں گے، اور اگر آپ تیس سال تک اس قانون کو منجمد کر سکتے ہیں، تو پھر میں پارلیمان میں ترمیمی بل پیش کرنے کے بجاے شرعی عدالت کے فیصلے کا انتظار کر لوں گا ! اس پر ظاہر ہے کہ انھیں ہاتھ کھڑے کرنے پڑے کیونکہ وہ کبھی اس قانون کو معطل کرنا پسند نہیں کریں گے۔

واضح رہے کہ اس قانون کے وضع کیے جانے سے قبل اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے مسودے کا تفصیلی جائزہ لے کر صریح الفاظ میں اسے اسلامی احکام سے متصادم قرار دیا تھا۔ کونسل کی بات تو آپ نے مانی نہیں۔ شرعی عدالت میں جانے کا کہہ رہے ہیں اور وہاں اس کا فیصلہ ہونے میں کئی عشرے لگ جائیں گے۔ تو پارلیمان میں ہی کیوں نہ ترمیمی بل پیش کیا جائے تاکہ جہاں سے غلطی کا آغاز ہوا ہے، وہیں سے اس کی اصلاح کی جائے؟

اس قانون کے محافظین نے ایک بہانہ یہ بھی پیش کیا کہ چونکہ اس قانون کے خلاف درخواست شرعی عدالت میں دائر کی جاچکی ہے، اس لیے یہ معاملہ اب "subjudice" ہے، یعنی عدالت کے سامنے زیرِ غور ہے، اور اس لیے اس کو کسی اور فورم پر اٹھایا نہیں جاسکتا۔ یہ نہ صرف یہ کہ ایک لولا لنگڑا عذر ہے بلکہ گمراہ کن بات بھی ہے۔ کوئی ایسا قانون یا اصول نہیں ہے جو پارلیمان کو اس قانون میں ترمیم سے روک سکے۔ بھئی، شرعی عدالت میں درخواست گزار نے یہی اعتراض کیا ہے نا کہ یہ قانون اسلامی احکام سے متصادم ہے۔ تو اگر پارلیمان ہی اس اعتراض پر بحث کرنے کے بعد مناسب اور ضروری سمجھے تو قانون میں ترمیم کرلے، تو اس پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ پھر تو درخواست گزار کا اعتراض ہی ختم ہوجائے گا اور عدالت میں دائر کیا گیا مقدمہ خارج کردیا جائے گا۔

اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ توہینِ رسالت کے قانون ہی کی مثال لے لیجیے۔

سپریم کورٹ کے سینیئر وکیل اسماعیل قریشی نے جنرل محمد ضیاء الحق کو فریق بناکر وفاقی شرعی عدالت میں درخواست دائر کی کہ جنرل صاحب نے اپنے صدارتی احکام کے ذریعے مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان میں توہینِ صحابہ، توہینِ امہات المؤمنین اور توہینِ اہل بیت پر سزائیں مقرر کی ہیں لیکن توہینِ رسالت پر سزا نہیں ہے۔

اس مقدمے کا عنوان ہے اسماعیل قریشی بنام جنرل محمد ضیاء الحق۔ شرعی عدالت نے اس درخواست کی سماعت کی اور فیصلہ محفوظ کرلیا لیکن یہ فیصلہ سنانے کی نوبت کبھی نہیں آئی کیونکہ اس دوران میں پارلیمان نے مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان میں دفعہ 295-سی کا اضافہ کرکے توہینِ رسالت پر موت یا عمر قید مع جرمانے کی سزائیں مقرر کردیں۔

اس لیے یہ کوئی عذر نہیں ہے کہ چونکہ اس قانون کے خلاف درخواست عدالت میں زیرِ غور ہے، تو پارلیمان اس قانون میں ترمیم کے لیے بل پر غور نہ کرے۔

ٹرانس جینڈر اشخاص (حقوق کا تحفظ) قانون، 2018ء: مسئلہ کیا ہے؟ (3)

قانون کے متن کا جائزہ

ان دو اصولی نکات کے بعد اب اس قانون کے متن کا جائزہ لیتے ہیں۔
اس قانون کی دفعہ 2 تعریفات پر مشتمل ہے جہاں اس قانون میں استعمال کیے گئے الفاظ و تراکیب کی تعریفات پیش کی گئی ہیں۔

دفعہ 2، ذیلی دفعہ 1، شق ای میں "اظہارِ صنف" کی تعریف یہ پیش کی گئی ہے :
"اظہارِ صنف سے مراد کسی شخص کا اپنی صنفی شناخت کا پیش کرنا ہے اور جو دوسرے محسوس کریں۔"

پھر دفعہ 2، ذیلی دفعہ 1، شق ایف میں "صنفی شناخت" کی تعریف یوں دی گئی ہے :
"صنفی شناخت سے مراد ہے کسی شخص کا اپنے بارے میں سب سے اندرونی اور انفرادی احساس کہ وہ مرد ہے، عورت ہے، دونوں کا مجموعہ ہے، یا دونوں نہیں، جو اس جنس کے ساتھ ہم آہنگ ہو یا نہ ہو جو پیدائش کے وقت اسے دی گئی۔"

خوب اچھی طرح نوٹ کر لیں کہ یہاں "جنس (sex) "اور "صنف (gender) "میں فرق کیا گیا ہے اور اہمیت صنف کو دی گئی ہے اور صنف کا فیصلہ کسی شخص کے "سب سے اندرونی اور انفرادی احساس (innermost and individual sense) "پر مبنی قرار دیا گیا ہے۔ ان تعریفات کی زد اصل میں کہاں پڑتی ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے دیکھیے "ماورائے صنف شخص" یعنی ٹرانس جینڈر پرسن کی تعریف جو دفعہ 2، ذیلی دفعہ 1، شق این میں دی گئی ہے۔

ماورائے صنف شخص کی تعریف میں تین قسمیں ذکر کی گئی ہیں:
ایک خسرا، جسے intersex کہا گیا ہے، اور اس کی توضیح یوں کی گئی ہے کہ یہ وہ شخص ہے جس میں مرد اور عورت دونوں کی جنسی علامات پائی جائیں، یا جس کی جنس کے متعلق ابہامات پائے جائیں؛
دوسری، خواجہ سرا (eunuch) جس کی تعریف یہ پیش کی گئی ہے کہ اس شخص کو پیدائش کے وقت مرد کی جنس دی گئی ہوتی ہے لیکن اس کے بعد اس کا جنسی عضو کاٹ لیا گیا ہو یا اسے نامرد بنا دیا گیا ہو؛
تیسری قسم (اور یہیں سارے فساد کی جڑ پائی جاتی ہے) کو ہی اصل ماورائے صنف قرار دے کر اس کی تعریف یوں پیش کی گئی ہے:

ماورائے صنف مرد، عورت، خواجہ سرا، یا کوئی بھی شخص (جی ہاں، اچھی طرح نوٹ کرلیں، کوئی بھی شخص) جس کی صنفی شناخت یا جس کا اظہارِ صنف (ان دونوں تراکیب کی تعریف اوپر دی گئی ہے، وہ دوبارہ ملاحظہ فرمالیں) ان سماجی اقدار اور ثقافتی توقعات سے مختلف ہو جو اس جنس پر مبنی ہوں جو اسے پیدائش کے وقت دی گئی تھی۔

انٹر سیکس اور یونخ کی طرف تو بعد میں جائیں گے، اور وہ اس قانون کے اصل موضوع ہیں بھی نہیں۔ سرِ دست توجہ کیجیے "ماورائے صنف مرد، عورت، خواجہ سرا، یا کسی بھی شخص" پر اور اس تعریف کو بار بار پڑھیے تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

سب سے پہلے تو اس تعریف میں "یا کسی بھی شخص (or any person) " کے الفاظ پر غور کریں۔ ان الفاظ سے قبل تین خاص صورتیں ذکر کی گئی ہیں: ماورائے صنف مرد، ماورائے صنف عورت، خواجہ سرا۔ اب ان تین خاص صورتوں کے بعد بالکل عمومی صورت ذکر کی گئی: یا کوئی بھی شخص۔ اصول فقہ کی اصطلاح استعمال کریں، تو یہ ذکر العام بعد الخاص ہے۔ گویا اصل ہدف اس عموم کا بیان تھا اور پہلے چند خاص صورتیں صرف بطورِ مثال ذکر کی گئی ہیں۔

چنانچہ ایک نتیجہ تو اس سے یہ نکلا کہ "ماورائے صنف شخص" کی کیٹگری صرف چند مخصوص افراد کے لیے نہیں ہے، بلکہ یہ "سہولت" اس قانون نے "کسی بھی شخص" کے لیے پیدا کی ہے کہ وہ کسی بھی وقت اپنی صنف (gender) سے ماورا (trans) ہو کر کسی اور صنف میں جا سکتا/سکتی/سکتا۔ سکتی ہے۔ ٹرانس کا مفہوم سمجھ میں نہ آ رہا ہو، تو "ماورائے قوم وجود (transnational entity) " کی ترکیب پر غور کریں جو بعض لوگ مسلمانوں کے تصورِ "امت" کے لیے استعمال کرتے ہیں کیونکہ امت کی شناخت قوم کی شناخت سے ماورا اور بالا ہوتی ہے۔ اسی طرح ٹرانس نیشنل ٹیررزم پر غور کریں جو دہشت گردی کی اس صورت کو کہتے ہیں جو کسی خاص قوم، یعنی ملکی حدود میں مستقل مقید افراد کے مجموعے، تک محدود نہیں رہتی، بلکہ قومی شناخت کو توڑ کر ایک نئی شناخت قائم کرتی ہے۔

یہی کچھ ماورائے صنف شخص کرتا ہے !

الفاظ پر اچھی طرح غور کریں۔

پیدائش کے وقت اسے جو جنس" (sex) دی گئی (معاشرے نے کہا کہ یہ مرد ہے، وہ عورت ہے)، اس جنس کے ساتھ، جو ایک حیاتیاتی (biological) تصور ہے اور جس کا تعلق جسمانی ساخت سے ہے، سماج نے کچھ اقدار باندھی ہوئی ہیں (یہ مردوں کے کام ہیں، وہ عورتوں کے کام ہیں)، اور ثقافت نے اسی بنیاد پر کچھ توقعات قائم کی ہیں (مردانگی دکھاؤ، عورتیں ایسا نہیں کرتیں)، لیکن یہ شخص اس سماجی بندھن و ثقافتی بیڑیوں سے آزاد ہو کر اپنے لیے وہ صنف (gender) چنتا/چنتی/چنتا- چنتی ہے جو اس کے اپنے "سب سے اندرونی سطح اور انفرادی احساس" پر مبنی ہو۔

آسان الفاظ میں کوئی شخص جسمانی طور پر مرد ہے لیکن وہ مردوں وہ کام نہیں کرتا، جو سماجی اقدار کے مطابق مردوں کے کرنے کے ہیں یا جن کی توقع ثقافتی طور پر مردوں سے کی جاتی ہے، تو وہ یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی صنف تبدیل کر کے خود کو عورت کہلوائے۔ اسی طرح کوئی عورت بھی اپنا عورت پن ترک کر کے خود کو مرد کہلوا سکتی ہے۔

یہ بھی نوٹ کیجیے کہ بات یہیں تک محدود نہیں ہے کہ کوئی مرد خود کو عورت کہلوائے، یا عورت خود کو مرد کہلوائے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر کوئی مرد خود کو مرد و عورت کا مجموعہ، یا ان دونوں سے الگ نوعیت میں بھی شمار کر سکتا ہے؛ عورت بھی یہی کر سکتی ہے؛ خواجہ سرا بھی یہی کر سکتا ہے؛ اور "کوئی بھی شخص" یہ کر سکتا/کر سکتی/کر سکتا۔ کر سکتی ہے۔

مکرر عرض ہے: کوئی بھی شخص !

ٹرانس جینڈر اشخاص (حقوق کا تحفظ) قانون، 2018ء: مسئلہ کیا ہے؟ (4)

ماورائے صنف شخص کے بنیادی ترین حقوق

"ماورائے صنف شخص" کی تعریف سمجھنے کے بعد، اور یہ جاننے کے بعد کہ "کوئی بھی شخص" جب چاہے ماورائے صنف شخص کی تعریف میں شامل ہو سکتا ہے، آیئے اس قانون کی دفعہ 3 کی طرف جو ماورائے صنف اشخاص کے لیے بنیادی ترین اصول دیتی ہے۔

دفعہ 3، ذیلی دفعہ 1 نے قرار دیا ہے کہ ماورائے صنف شخص کا یہ حق ہے کہ اس کے لیے اس کے "ذاتی احساس پر مبنی صنفی شناخت (self-perceived gender identity) "تسلیم کی جائے۔

دفعہ 3، ذیلی دفعہ 2 کا کہنا ہے کہ نادرا سمیت تمام حکومتی محکموں پر لازم ہو گا کہ ماورائے صنف شخص کو اس کے ذاتی احساس پر مبنی صنفی شناخت کے ساتھ رجسٹر کرے۔

دفعہ 3، ذیلی دفعہ 3 کی رو سے ماورائے صنف شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ 18 سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد وہ اپنے ذاتی احساس پر مبنی صنفی شناخت کے ساتھ قومی شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات حاصل کرے۔

دفعہ 3، ذیلی دفعہ 4 آگے بڑھ کر یہ قرار دیتی ہے کہ اگر کسی ماورائے صنف شخص کو پہلے ہی قومی شناختی کارڈ جاری کیا گیا ہو، تو اس کا حق ہے کہ وہ ذاتی احساس پر مبنی صنفی شناخت کے ساتھ نیا قومی شناختی کارڈ حاصل کرے۔

ان چار باتوں پر اچھی طرح غور کیجیے اور دیکھیے کہ ان دفعات کا مفہوم اور نتائج کیا ہیں؟

چونکہ "کوئی بھی شخص" کسی بھی وقت "ذاتی احساس پر مبنی صنفی شناخت" کے ساتھ تسلیم کیے جانے کا حق رکھتا ہے، اس لیے اگر کوئی شخص جو جنسی طور پر مرد ہو اور وہ نادرا کے دفتر جا کر صرف اتنا قرار دے کہ اس کے ذاتی احساس کی بنا پر اس کی صنفی شناخت کو عورت قرار دیا جائے، تو نادرا کے پاس نہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے، نہ ہی نادرا کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ اس کا طبّی یا نفسیاتی معائنہ کرانے کا کہے۔ اب جب ایک مرتبہ اسے سرکاری کاغذات اور دستاویزات میں عورت قرار دیا گیا، تو اسے عورتوں کے سارے حقوق بھی میسر آ گئے۔ کسی گرلز کالج میں داخلے سے لے کر قومی و صوبائی اسمبلی اور سینیٹ کی رکنیت تک، کسی بس میں عورتوں کے لیے مخصوص سیٹوں سے لے کر کسی ریستوران میں عورتوں کے لیے مخصوص واش رومز تک؛ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر چونکہ یہ عورت ہے، تو اسے کسی مرد سے شادی کی بھی قانوناً

اجازت مل گئی، اور یاد رکھیے کہ یہ سب کچھ اسے "جنس" تبدیل کیے بغیر اور جسمانی ساخت میں تغیر لائے بغیر مل گیا !

یہی کچھ کوئی بھی خاتون کر سکتی ہے۔

اب ان کے ساتھ دفعات 4، 5 اور 6 کو ملائیے جن میں کافی تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ماورائے صنف شخص کے خلاف کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں برتا جائے گا، نہ ہی اسے ہراساں کیا جائے گا، اور اس ضمن میں حکومت کی ذمہ داریوں کی بھی تفصیل دی گئی ہے۔ اگر اس قانون کا اطلاق صرف خنثیٰ اور خواجہ سرا پر ہوتا تو مجھے ان تین دفعات پر شاید کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن چونکہ ان کا اطلاق ماورائے صنف اشخاص پر بھی ہوتا ہے، بلکہ اصلاً یہ قانون بنایا ہی ان لوگوں کے لیے گیا ہے جو اپنی صنف تبدیل کر کے کسی اور صنف میں جانا چاہتے ہیں یا کم از کم اپنی صنف سے نکلنا چاہتے ہیں، اس لیے یہ دفعات بھی بہت خطرناک نتائج کی حامل ہو گئی ہیں۔

پھر ماورائے صنف اشخاص کو یہ اختیار بھی مل گیا ہے کہ وہ اپنے ذاتی احساس پر مبنی صنفی شناخت کے ذریعے وراثت کے احکام بھی تبدیل کر سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی جسمانی اور جنسی طور پر عورت اگر وراثت میں زیادہ حصہ لینا چاہتی ہے، تو اس کا آسان حل یہ ہے کہ وہ نادرا کے پاس جا کر اپنے ذاتی احساس پر مبنی صنفی شناخت کو مرد کروا دے۔ پھر اسے کوئی مرد کا حصہ لینے سے روک نہیں سکے گا کیونکہ اس قانون کی دفعہ 7 کی رو سے یہ لازم ہے کہ وراثت کے حصے بھی ذاتی احساس پر مبنی صنفی شناخت کے مطابق دیے جائیں۔ (اس پر مزید بحث آگے آ رہی ہے۔)

ان امور کی بنا پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ اس قانون کے ذریعے نہ صرف ہم جنس پرست شادیوں اور جنسی بے راہ روی کی دیگر قسموں کو قانونی جواز دیا گیا ہے، بلکہ اس کے ذریعے خاندانی نظام کی جڑیں ہی اکھاڑی جا رہی ہیں۔

ٹرانس جینڈر اشخاص (حقوق کا تحفظ) قانون، 2018ء: مسئلہ کیا ہے؟ (5)

چند دنوں کے وقفے کے بعد آج پھر موقع ملا ہے کہ اس ادھوری بحث کو پوری کروں۔ اس سیریز کے 4 حصے چند دن قبل لکھے تھے اور میری وال پر موجود ہیں۔ پانچواں حصہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

ماورائے صنف اشخاص کے لیے حقِ وراثت

اب آیئے وراثت کے مسئلے پر۔
اس قانون کی دفعہ 7 میں ماورائے صنف اشخاص کی وراثت کے لیے اصول دیے گئے ہیں۔
ان میں پہلا اصول یہ ہے کہ ان اشخاص کو وراثت میں ان کا "جائز حق" دینے کے سلسلے میں کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا" جیسا کہ قانونِ وراثت میں مقرر کیا گیا ہے"۔ اب اگر صرف ان الفاظ کو دیکھیں تو ایک عام شخص کہے گا کہ ان میں غلط کیا ہے؟ امتیازی سلوک تو واقعی نہیں ہونا چاہیے، بالخصوص جبکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا جائز حق وہ ہے جو قانونِ وراثت میں مقرر کیا گیا ہے۔
لیکن بات اتنی سادہ نہیں ہے۔
پہلے اس امر کی طرف آیئے کہ "قانونِ وراثت" سے کیا مراد ہے؟ پاکستان میں وراثت کی تقسیم اور مختلف ورثا کے حصوں کے متعلق کوئی تفصیلی قانون موجود نہیں ہے۔ صرف مسلم فیملی لاز آرڈی نینس، 1961ء کی ایک دفعہ 4 ہے جس میں ان یتیم پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے لیے حق مقرر کیا گیا ہے جن کے والد یا والدہ کا انتقال ان کے (یعنی والد یا والدہ کے) باپ یا ماں (یعنی ان پوتے پوتیوں یا نواسے نواسیوں کے دادا/دادی یا نانا/نانی) کی زندگی میں ہی ہو گیا ہو۔ (عام طور پر اسے یتیم پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے حقِ وراثت کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے۔) اس ایک صورت کے علاوہ کوئی صورت ایسی نہیں ہے جس میں ورثا کے حقِ وراثت کے لیے ہمارے ہاں باقاعدہ قانون سازی کی گئی ہو۔

تو پھر پاکستان میں وراثت کس قانون کی رو سے تقسیم ہوتی ہے اور مختلف ورثا کے حصوں کا تعین کیسے کیا جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب مسلم پرسنل لا (شریعت) اپلی کیشن ایکٹ، 1962ء، کی دفعہ 2 میں ملتا ہے جہاں مختلف موضوعات کی ایک لمبی فہرست دی گئی ہے اور قرار دیا گیا ہے کہ ان امور میں "فیصلے کا قانون" شریعت ہے لیکن "قانون کے تابع"۔ چنانچہ جہاں قانون میں تصریح کی گئی ہے، جیسے مسلم فیملی لاز آرڈی نینس کی دفعہ 4 میں یتیم پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے لیے حقِ وراثت مقرر کیا گیا ہے، تو وہاں اس قانون کے مطابق حصہ دیا جاتا ہے، لیکن جہاں قانون میں حصے مقرر نہیں کیے گئے، تو وہاں حصوں کے لیے شریعت کی طرف دیکھا جاتا ہے اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ اس بات کا اضافہ کیجیے کہ آئین کی دفعہ 227 کی توضیح کی رو سے طے پایا ہے کہ اہلِ تشیع کے لیے ان کے فہمِ قرآن و سنت اور اہل سنت کے لیے ان کے فہمِ قرآن و سنت کے مطابق عمل کیا جائے گا، یعنی اہلِ تشیع کے لیے قانونِ وراثت کی حیثیت ان کی فقہ کو اور اہلِ سنت کے لیے قانونِ وراثت کی حیثیت ان کی فقہ کو حاصل ہے۔

یہ بات سمجھ میں آگئی ہے تو اس اصول کی رو سے ماورائے صنف اشخاص کے حقِ وراثت کے تعین کے لیے قانونِ وراثت کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے مذہبی گروہ کی فقہ اس معاملے میں کیا کہتی ہے۔

تاہم ایک تو، جیسا کہ ہم نے تفصیل سے واضح کیا ہے، اس قانون کی رو سے ماورائے صنف اشخاص سے مراد صرف جسمانی طور پر خنثی یا خواجہ سرا نہیں ہیں، بلکہ وہ لوگ بھی ہیں جو جنس کی بنیاد پر صنف سے انکاری ہو کر اپنی صنف تبدیل کر لیتے ہیں، یعنی جسمانی طور پر مرد ہونے کے باوجود شناختی کاغذات میں خود کو عورت یا مرد و عورت کا مجموعہ یا ان میں کچھ نہیں قرار دیں، یا جسمانی طور پر عورت ہونے کے باوجود خود کو مرد یا مرد و عورت کا مجموعہ یا ان میں کچھ نہیں قرار دیں۔ اس لیے دفعہ 7 کی ذیلی دفعہ 1 میں کہی گئی بات جو پہلی نظر میں بہت سادہ اور معصوم لگتی ہے، اتنی سادہ اور معصوم ہر گز نہیں ہے۔

اب آیئے، دفعہ 7 کی ذیلی دفعہ 2 کی طرف جس میں قرار دیا گیا ہے کہ وراثت کے حصوں کے لیے صنف کا تعین شناختی کارڈ پر مذکور صنف سے ہو گا، اور یہ تو آپ دفعہ 3 میں دیکھ ہی چکے ہیں کہ شناختی کارڈ میں صنف

کا اندراج کسی شخص کے "ذاتی احساس پر مبنی اظہارِ صنف" پر ہوتا ہے۔ چنانچہ آسان الفاظ میں اس ذیلی دفعہ کا مفہوم یہ ہوا کہ ماورائے صنف اشخاص کو وراثت میں ان کے مذہبی گروہ کی فقہ کے مطابق ان کی جسمانی ساخت پر مبنی صنف کا حصہ نہیں ملے گا بلکہ انھیں وہی حصہ ملے گا جو اس صنف کو ملنا ہے جسے انھوں نے اپنے ذاتی احساس کی بنیاد پر چنا ہے !

اب اس کے بعد دفعہ 7 کی ذیلی دفعہ 3 پر آیئے، تو اس نے یہ ساری بات جسے یہاں تک گول مول رکھا گیا تھا، صاف صاف بتا دی ہے۔ چنانچہ یہاں درج ذیل اصولوں کی تصریح کی گئی ہے:

اولاً: اگر ماورائے صنف شخص مرد ہو (یعنی کسی اور صنف سے اپنے ذاتی احساس کی بنا پر اٹھ کر اس نے مردوں کی صنف اختیار کر لی ہو)، تو اسے مرد کا حصہ ملے گا؛

ثانیاً: اگر ماورائے صنف شخص عورت ہو (یعنی کسی اور صنف سے اپنے ذاتی احساس کی بنا پر اٹھ کر اس نے عورتوں کی صنف اختیار کر لی ہو)، تو اسے عورت کا حصہ ملے گا؛

ثالثاً: اگر کسی شخص کی صنف کا تعین مشکل ہو، اور یہاں مراد وہ اشخاص ہیں جن کی صنف کا تعین ان کی جسمانی ساخت کی بنا پر کیا جا رہا ہو، تو ان کے لیے درج ذیل چار قواعد دیے گئے ہیں:

ایک یہ کہ اگر 18 سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد انھوں نے ذاتی احساس کی بنا پر خود کو مرد قرار دیا ہو، تو انھیں مرد کا حصہ ملے گا؛

دوسرا یہ کہ اگر 18 سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد انھوں نے ذاتی احساس کی بنا پر خود کو عورت قرار دیا ہو، تو انھیں عورت کا حصہ ملے گا؛

تیسرا یہ کہ ایک یہ کہ اگر 18 سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد انھوں نے ذاتی احساس کی بنا پر خود کو نہ مرد قرار دیا ہو نہ ہی عورت، تو انھیں مرد اور عورت کے حصوں کا اوسط حصہ ملے گا؛ اور

چوتھا یہ کہ 18 سال سے کم عمر کے شخص کے حقِ وراثت کا مسئلہ ہو، تو اس کے لیے صنف کا تعین میڈیکل ڈاکٹر اس کے غالب مردانہ یا زنانہ خصوصیات کی بنا پر کرے گا۔

یہاں تین مزید باتیں نوٹ کر لیں، تو یہ تصویر پوری ہو جائے گی:

ایک یہ کہ اس دفعہ میں صنف کا تعین بنیادی طور پر جسمانی خصوصیات کی بنا پر کیا جارہا ہے، سوائے ان صورتوں کے جن میں اس شخص کا ذاتی احساس پر مبنی اظہارِ صنف اس کی جسمانی خصوصیات سے مختلف ہو۔ بہ الفاظِ دیگر، یہ قانون بنانے والے یہاں خود بھول گئے ہیں کہ ان کا تو سارا فلسفہ ہی ان مفروضوں پر کھڑا تھا کہ جسمانی خصوصیات پر صنف کا تعین نہیں کیا جانا چاہیے اور یہ کہ جنس اور صنف میں فرق ہوتا ہے۔

دوسری یہ کہ نابالغ بچے کے لیے ہی سہی، یہ قانون بنانے والوں نے یہ دو اصول تسلیم کر لیے ہیں کہ صنف کے تعین کے لیے میڈیکل ڈاکٹر کی راے لینی چاہیے اور یہ کہ ڈاکٹر کی راے اس بات کی تعین کے لیے ہوگی کہ اس شخص کی غالب خصوصیات مردانہ ہیں یا زنانہ۔ سوال یہ ہے کہ یہی اصول 18 سال کی عمر کے بعد کے اشخاص کے لیے کیوں نہیں مانے گئے؟ اس سوال کے جواب پر غور کریں گے تو لبرلزم کے اصل فساد تک رسائی ہوگی۔

تیسری یہ کہ یہاں یہ قانون بنانے والے صنفوں کو دو (مردانہ و زنانہ) تک محدود نہ رکھنے کی بات بھی بھول گئے ہیں اور تفصیلی ضابطہ، بلکہ ضوابط، دے کر یہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس شخص کو وراثت میں حصہ مرد کا ملے گا یا عورت کا۔ یہ کیوں؟ یہ اس لیے کہ لاشعوری طور پر ہی سہی، اور وراثت کے شعبے تک محدود ہی سہی، وہ یہ بات مانتے ہیں کہ شریعت میں صنف بس دو ہی ہیں!

ٹرانس جینڈر اشخاص (حقوق کا تحفظ) قانون، 2018ء: مسئلہ کیا ہے؟ (6)

دفعات 8 تا 17: ماوراے صنف اشخاص کے خصوصی حقوق

دفعات 8 تا 15 میں ماوراے صنف اشخاص کے حقوق کی تفصیلات دی گئی ہیں، جبکہ دفعہ 16 میں تصریح کی گئی ہے کہ آئین میں مذکور تمام بنیادی حقوق ان کو میسر ہوں گے۔ ایک تو اس عمومی دفعہ کی موجودگی میں خصوصی دفعات کی ضرورت ہی نہیں تھی، بلکہ آئین میں مذکور بنیادی حقوق چونکہ تمام شہریوں کو

دستیاب ہیں(اوران میں بعض حقوق پاکستان میں موجود تمام "اشخاص" کو حاصل ہیں، خواہ وہ شہری نہ ہوں)،اس لیے خصوصی دفعہ 16 کی بھی ضرورت نہیں تھی۔تاہم اگراس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ ایسا صرف غلط فہمی دور کرنے اور صراحت سے بات کرنے کے لیے کیا گیا ہے، تواس کے بعد اس امر پر غور پھر سے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس قانون کی رو سے ماورائے صنف اشخاص سے مراد کون ہیں اور ان کے لیے یہ حقوق ماننے کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟

مثلاً دفعہ 10 میں ماورائے صنف اشخاص کو قومی، صوبائی اور مقامی انتخابات میں ووٹ ڈالنے کے حق کا ذکر ہے،اوراس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان اشخاص کے لیے پولنگ سٹیشن کا انتخاب ان کی اس صنف کے مطابق ہو گا جو ان کے قومی شناختی کارڈ میں مذکور ہو،اور ہم یہ تو تفصیل سے واضح کر چکے ہیں کہ قومی شناختی کارڈ میں صنف کا اندراج "ذاتی احساس پر مبنی اظہارِ صنف" پر ہوتا ہے۔ چنانچہ جس مرد نے اپنی صنف سے نکل کر اپنے لیے عورت کی صنف چنی ہو، جسے یہاں transwoman یعنی ماورائے صنف عورت کہا گیا ہے،اسے عورت ہی مانا جائے گا اور اسے عورتوں ہی کے پولنگ سٹیشن میں ووٹ ڈالنے کا حق ہو گا۔اس بات کے نتائج و عواقب کو سمجھنے کے لیے ایک دفعہ پھر ماورائے صنف شخص کی تعریف پر غور کیجیے جس پر ہم اس سلسلے کی ابتدا میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

دفعہ 12 میں صحت کے حق سے متعلق تفصیلات دی گئی ہیں اور ان میں ایک اہم بات ذیلی دفعہ سی میں کہی گئی ہے کہ انھیں تمام ضروری طبّی اور نفسیاتی "صنفی تصحیحی (gender corrective) " سہولتوں تک رسائی یقینی بنائی جائے گی۔ان صنفی تصحیحی سہولتوں میں کیا کچھ آتا ہے،اس کی تفصیل اس قانون (Act) کے تحت بنائے گئے قواعد (Rules) میں دیکھ لیجیے جہاں بتایا گیا ہے کہ "صنفی تصدیقی خدمات (gender affirming services) "میں درج ذیل امور شامل ہیں :

-ہارمون تھراپی؛

-سرجری؛

-چہرے سے بال ختم کرنا؛

-بولنے اور آواز سے متعلق علاج(جیسے عورت کی آواز کو بھاری کرنا ہو، یا مرد کی آواز کو باریک کرنا ہو)؛

۔ جنسی اعضاء کو پست کرنا، ختم کرنا یا سینے میں ابھار پیدا کرنا۔

واضح رہے کہ جہاں قانون میں کسی تصور کی تعریف میں "شامل ہیں(includes) " کہا جائے، تو وہ تعریف جامع (comprehensive) یا مکمل (exhaustive) نہیں ہوتی اور اس تعریف میں اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے جو یہاں الفاظ میں ذکر نہ کیا گیا ہو۔ بہ الفاظِ دیگر، یہ تعریف صرف ان امور کی چند مثالیں پیش کر رہی ہے، وہ جیسا کہ عربی میں کہا جاتا ہے کہ علی سبیل المثال، لا الحصر۔

ان سارے امور اور ان سارے حقوق کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ صرف خنثی یا خواجہ سرا کے ساتھ متعلق ہوتے، تو ان پر بحث کی جا سکتی تھی کہ ان میں کیا کچھ قابلِ قبول ہے اور کیا کچھ مسترد کیا جانا چاہیے، لیکن جب یہ سب کچھ ان افراد کے لیے بھی میسر ہے جو خواہ جسمانی طور پر مرد یا عورت ہوں لیکن محض اپنے ذاتی احساس پر مبنی اظہارِ صنف کی بنا پر اپنی صنف چھوڑ کر کوئی اور صنف اختیار کر چکے ہوں، تو پھر ان میں کچھ بھی قابلِ قبول نہیں رہتا، شرعاً بھی اور آئین کی رو سے بھی۔

دفعہ 17 میں ان لوگوں کے لیے 6 ماہ کی قید یا 50 ہزار روپے جرمانے (یا دونوں) کی سزا مقرر کی گئی ہے جو کسی ماورائے صنف شخص کو بھیک مانگنے پر مجبور یا اس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

آخری دفعات

دفعہ 18 سے 21 تک عمومی نوعیت کی دفعات ہیں جو آج کل پارلیمان تقریباً ہر قانون میں ڈالتی ہے لیکن ان میں خصوصاً دفعہ 19 انتہائی خطرناک نتائج کی حامل ہے۔ اس دفعہ کی رو سے اس قانون کو دیگر تمام رائج الوقت قوانین پر بالاتر حیثیت (overriding effect) دی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی اور قانون کے ساتھ تعارض کی صورت میں اس قانون پر عمل درآمد کیا جائے گا !

اس کے نتائج کے لیے اس مثال پر غور کریں کہ اگر کوئی شخص جسمانی طور پر مرد ہو لیکن وہ ذاتی احساس پر مبنی اظہارِ صنف کی چھتری استعمال کرتے ہوئے ایک بیانِ حلفی پر اپنی صنف تبدیل کرے اور یوں وہ "ماورائے صنف عورت" بن جائے، تو شناختی کارڈ اور دیگر قانونی دستاویزات میں اب اسے عورت لکھا اور

پکارا جائے گا۔ اب یہ عورت، یا ماورائے صنف عورت یا مخنث، اگر کسی مرد سے شادی کرنا چاہے، تو قانون کی رو سے اس سے نہیں روکا جاسکے گا کیونکہ قانون تو اسے عورت مانے گا اور عورت کا مرد سے نکاح پاکستان کے قانون کی رو سے ہو سکتا ہے۔ مسلم پرسنل لا شریعت اپلی کیشن ایکٹ، 1962ء، کی دفعہ 2 کے تحت پاکستان میں مسلمانوں کی شادی کے لیے قانون کی حیثیت شریعت کو حاصل ہے، لیکن یہ حیثیت ہے " قانون کے تابع "، اور جیسا کہ پیچھے واضح کیا گیا، جہاں قانون موجود ہو، وہاں قانون پر عمل ہو گا اور قانون نہ ہو، تو پھر شریعت پر عمل ہو گا۔ اب اس کے ساتھ اس موجودہ قانون کی دفعہ 19 ملایئے جس نے اس قانون کو 1962ء کے اس قانون سمیت تمام قوانین پر بالاتر حیثیت دے دی ہے، اور اس قانون میں بتایا گیا ہے کہ صنف کا تعین کسی شخص کے ذاتی احساس پر مبنی اظہارِ صنف کے ذریعے کیا جائے گا۔ چنانچہ اگر یہ شخص خود کو عورت کہتا ہے، تو اسے عورت ہی مانا جائے گا اور اس عورت کا کسی مرد سے نکاح جائز ہو گا۔

کہاں ہیں وہ لوگ جو یا تو بہت سادہ لوح ہیں یا بہت چالاک، جو کہتے ہیں کہ اس قانون کا ہم جنس پرستی سے کوئی تعلق نہیں ہے؟